''سیّدی وابی''.....داستانِ حیاتِ امیرِ شریعتؒ

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

''سیّدی وابی'' امیرِ شریعت، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے سوانح و افکار پر مبنی کتاب ہے جو ان کی بیٹی سیدہ اُمِّ کفیل بخاری صاحبہ نے تحریر کی۔ یہ کتاب ایک بیٹی کی زبانی اپنے والد کے سوانحی اشارات کا ایک ایسا خاکہ پیش کرتی ہے جو نہایت جان دار ہے۔ یہاں ہمیں اس معروف مذہبی شخصیت کے ذاتی احوال پر مشتمل ایسے کوائف ملتے ہیں جن کی صداقت میں شائبہ کرنا مشکل ہے۔ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا حافظہ بے مثل تھا، قدرت نے یہی وصف ان کی دختر کو بھی عطا فرمایا ہے چنانچہ اپنے والدِ محترم کا سوانحی خاکہ قلم بند کرتے ہوئے ایسی ایسی جزئیات صفحۂ قرطاس پر اُتر آئی ہیں کہ پڑھنے والا متحیّر رہ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ تخلیقی استعداد نے ان کی نثر میں ادبی شان پیدا کر دی ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں جا بجا ایسی مثالیں نظر آتی ہیں جن میں خاکہ نگاری کا سارا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ ایسی جزئیات نگاری، کرداری زوایے اور حقائق آفرینی بڑے بڑے ادبا کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالباً یہ جذبے کی صداقت ہے جس کی وساطت سے تحریر زندہ محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص جب وہ اپنے والدِ گرامی کی دس سالہ اسارت اور اس کے ان کی نجی زندگی پر اثرات کے قصے سناتی ہیں تو ہر ورق پر باپ کی شفقت و عاطفت اور بیٹی کی انسیت و محبت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد علاّمہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا اپنی بیٹی کے متعلق کہا گیا یہ جملہ مبنی پر صداقت لگتا ہے، جس میں کہتے ہیں کہ:

''میری بیٹی.....میرے ظاہری اسباب میں سے، میری حیات کا باعث ہے''

واقعۃً سیّدہ مرحومہ اپنے والدِ گرامی پر کامل سوانحی تصنیف پیش کر کے ان کی حیاتِ سعید کو محفوظ کرنے کا باعث بنی ہیں۔

پیشِ نظر کتاب جذبہ و احساس اور تحقیق و ترتیب کا ایک عمدہ امتزاج ہے۔ یہاں ایک بیٹی کے جذبات و احساسات کے غماز بے شمار دل چسپ واقعات مرقوم ہیں مگر ان کی پیش کش کا اہتمام تحقیقی و ترتیبی حُسن رکھتا ہے۔ اس کتاب کے تحقیقی مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیرِ شریعتؒ یکم ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو بروز جمعۃ المبارک بوقتِ سحر پیدا ہوئے اور انتقال ۹ ربیع الاوّل ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء بعد العصر، بروز پیر ہوا۔ آپ ''رہِ عشق کے مسافر'' تھے اور تحفظِ ختمِ نبوّت کے سلسلے میں آپ کی خدمات سے انکار نہیں۔ ان کا مؤقف ہمیشہ یہی رہا کہ:

''مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا، دنیا میں امن نہ ہوگا۔''

چنانچہ وہ دنیاوی آقاؤں سے متنفّر تھے، خصوصاً انگریز کی حاکمیت کے سراسر خلاف تھے۔ زیرِ نظر کتاب سے بخاریؒ صاحب مرحوم کی گفت گو سے ایک شذرہ دیکھیے:

''میں کوئی دستوری نہیں ہوں، سپاہی ہوں۔ تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا ہوں اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو اُن چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے بھی تیار ہوں جو ''صاحب بہادر'' کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم! میرا ایک ہی دشمن ہے..... انگریز، اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیا۔ بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہوگئی کہ قرآنِ حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی (مرزا قادیانی) پیدا کیا، پھر اس ''خود کاشتہ'' پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے..... تم فرنگی کو نہیں جانتے۔ اس نے روحیں قتل کر دی ہیں، روحیں..... اسلام اُٹھ گیا، مسلمان رہ گئے!''

یہ وہ نظری رویہ ہے جو علاّمہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے حوالے سے سیّدہ محترمہ نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کمال یہ ہے کہ اس نظریاتی و علمی شخصیت کے حوالے سے معلومات کا استخراج ان کے ذاتی وقائع سے ہوا ہے۔ شخصی کوائف کی پیش کش میں مکمل تحقیقی اپروچ ملتی ہے، مثلاً اُن کا مختصر (مگر بلیغ) سوانحی خاکہ، جو بہت سائنٹیفک انداز میں مرتب ہوا ہے، اور پہلی بار مکمل صورت میں شامل کتاب ہوا ہے، اس حوالے سے قابلِ داد ہے۔ پھر اُن کا ایک تفصیلی شجرہ نسب بڑے قرینے سے اس خاندان کا تعارف کراتا ہے۔ جا بجا ماخذاتِ تحریر کی نشان دہی کی گئی ہے اور موجودہ صورت میں ڈھلنے تک یہ کتاب کن متفرق اشکال میں سامنے آتی رہی، اس جانب بھی بڑے قرینے سے توجہ دلائی گئی ہے۔ حصہ اوّل میں شخصی و سوانحی افکار متفرق عناوین کے تحت تحریر کیے گئے ہیں جب کہ حصہ دوم علاّمہؒ کے ۲۳ مکاتیب پر مبنی ہے جن کے حواشی بھی سیّدہ اُمِّ کفیل کے تحریر کردہ ہیں۔ یہ حاشیے محض تعارفی سطور نہیں بلکہ محنت و دقت سے مرتب کی گئی معلومات ہیں۔ یوں جذبہ و احساس اور تحقیق و ترتیب نے پیش نظر تصنیف میں ڈھل کر ایک پرکشش صورت اختیار کر لی ہے۔

''سیّدی وابی'' کے حصہ اوّل میں بہ ظاہر ایک بیٹی کے جذبات و احساسات پر مبنی وقائع پیش ہوئے ہیں لیکن بہ باطن امیرِ شریعتؒ کی سوانح کے دل چسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ مصنفہ کا انداز زیادہ تر واقعاتی ہے۔ اس حد تک کہ اکثر مقامات پر کہانی پن کا احساس ہوتا ہے۔ زبان بہت شُستہ و شائستہ اور رواں دواں ہے۔ واقعے کی بُنت کرتے ہوئے جب وہ مکالماتی رنگ اپناتی ہیں، تو قصے میں مزید روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جزئیات کی کثرت ہے اور فارسی و عربی آہنگ کی حامل زبان نے ایسے مواقع پر بڑی دل کشی کا سامان کیا ہے۔ اگرچہ آغازِ کتاب میں مصنفہ نے تحریر فرمایا کہ:

''محبت صرفی نحوی قواعد اور تعبیر و انشا کی ترکیب و ترتیب سے آزاد ہوتی ہے۔'' اور یہ کہ وہ ''ٹوٹے پھوٹے الفاظ'' میں دلی جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلوبی حوالے سے ایسا نہیں ہے۔ یہاں ہمیں خالص اردو پڑھنے کو ملتی ہے۔ اکثر مقامات پر اسلوب تحریر شاعرانہ ہو گیا ہے۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار و مصاریع بہ کثرت

پیوندِ نثر ہوئے ہیں۔ متعدد مواقع ایسے ہیں جہاں اُن کی نثر شگفتگی کے عنصر سے آمیز ہو کر بہت لطف دیتی ہے۔ خصوصاً پنجابی زبان یا کسی مقامی زبان کے ٹکڑے جب ظریفانہ آہنگ کی تعمیر کرتے ہیں، تو پڑھنے والا حظ اٹھاتا ہے۔ صورتِ واقعہ کی پیش کش میں سیّدہ اُمِّ کفیل نے بڑی مہارت دکھائی ہے۔ ان کے واقعاتی سحر کاری میں منظر آفرینی کا خاص کردار ہے۔

اپنے والد مرحوم نشست و برخاست، خورد و نوش، گفت و شنید اور دیگر معمولاتِ زیست کو وہ بہ نظرِ غائر حاشیۂ خیال میں لائی ہیں اور بڑی جاذبیت کے ساتھ اپنی نثر کا حصہ بنا دیتی ہیں۔ حافظے کی پختگی کے باعث متعدد مقامات پر والد کے اقوال برمحل منقول ہیں جس سے تحریر مستند ہو جاتی ہے۔ یہاں بچپن کے سیکڑوں واقعات، بہن بھائیوں کے ننھے منّے، قصّے والدین کی شفقت و محبت کی داستان پرکشش رنگ میں تحریر ہوئی ہے، مثلاً یہاں والد کی یاد، بیٹی کی نظر میں ملاحظہ کیجیے:

''ایک دفعہ وہ بہت دنوں کے لیے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے۔ میں نے وہی برتن اٹھایا اور اس سے ابا جی کی طرح ہی منہ لگا کر پانی پیا۔ جب ابا جی واپس آئے اور حسبِ معمول کھانا کھاتے وقت مجھے ساتھ بٹھا لیا تو میں نے کہا ابا جی میرا دل آپ کے لیے بہت اداس تھا تو میں نے اس برتن سے ویسے ہی منہ لگا کر پانی پیا تھا جیسے آپ پیتے ہیں۔ ''ابا جی! ایہہ وی تے اک طرح دی یاد ای ہے نا؟'' (یہ بھی تو ایک طرح کی یاد ہی ہے نا؟)

یہ بات ان کے دل کو لگی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

جیسا کہ ذکر ہوا کہ اس تصنیف کا ادبی پہلو بہت جان دار ہے۔ چناں چہ یہاں نثر کی ادبی خوبیوں کی فراوانی تو ہے ہی خالصتاً ادبی اشارات بہ کثرت ہیں۔ مثلاً اشعار و تراکیب کی کثرت ہے اور یہ شعرا اپنے بھی ہیں اور دوسروں کے بھی۔ متعدد معروف ادبا و شعرا کا تذکرہ ہے اور اس سلسلے میں کسی خاص مکتبۂ فکر کی قید نہیں ہے۔ ایسے ایسے ادبی واقعات سامنے آئے ہیں جو شاید اس طور پر کسی ادبی سوانحی کتاب کا حصہ نہ بنے ہوں۔ وہ بتاتی ہیں کہ والدِ گرامی اقبالؒ کے ارادت مند تھے اور ''لاہور میں ہوتے تو اقبال کی مجالس میں شریک ہوتے۔ اقبالؒ باوضو ہو کر بیٹھ جاتے اور ابا جی سے فرمائش کر کے قرآن کریم سنتے۔ خاص طور پر سورۃ مزمّل۔ پھر ان کی فرمائش پر اپنا کلام سناتے۔ ابا جی بتایا کرتے کہ قرآن کریم سنتے وقت اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر اقبالؒ کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔'' اسی طرح علامہؒ نے جب نظم ''موت'' لکھی تو کہا: ''پیر! ویکھ میں تیری موت لکھی اے'' (مرشد! دیکھو میں نے تمہاری موت لکھی ہے) اقبالؒ کے علاوہ بھی بہت سے ادبا و شعرا سے ان کے تعلق کا سراغ ملتا ہے، مثلاً عبدالحمید عدم، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، شورش کاشمیری، مولانا ظفر علی خان، ایم۔ ڈی تاثیر، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، شکیل بدایونی وغیرہ کے تذکارِ لطیف قلم بند ہوئے ہیں۔ پھر ایسی ادبی شخصیات جن کی زندگی کا سیاسی پہلو نمایاں رہا، ان سے مولاناؒ کے تعلق کی نشان دہی بھی وہ کرتی ہیں، جیسے چودھری افضل حق اور مولانا ابوالکلام آزاد..... یوں شخصی زاویوں پر مبنی اس حصے میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شخصیت کے خدوخال نمایاں کیے گئے ہیں اور ایک عظیم باپ کے ساتھ ساتھ وہ جس طرح ایک مکرم رہ نما کے طور پر جانے جاتے تھے، اس مرتبے کے پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے والد کو ایک مونس و غم خوار کے طور پر یاد کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں

جذبات شعر کے قالب میں میں ڈھل جاتے ہیں، مثلاً چند ابیات:

جنوں میں فصلِ بہاری ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خوں رلاتی ہے
تری عطوفت و رأفت کی یاد یوں کہیے
شعاعِ نور کہ سینے میں جھلملاتی ہے
تفکرات و حوادث نے کر دیا محزوں
تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے
ترے کمال خطابت کا تذکرہ جب ہو
عدو بھی کہتے ہیں، تاریخ جگمگاتی ہے

کتاب کے دوسرے حصے میں امیرِ شریعتؒ کے مکاتیب مع حواشی پیش ہیں۔ جنھیں ان کے عکس تحریر سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ خطوط سیاسی حوادث کا سراغ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے والدگرامی کے شخصی و قلبی واردات سے آگاہ کراتے ہیں۔ خصوصاً زمانۂ اسارت کی داستان اور اعزّہ و اقربا سے قلمی ملاقاتوں کا احوال پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں دینی مسائل پر گفت گوئیں بھی ہیں، تعبیراتِ خواب اور وظائف و اوراد کی تفصیلات بھی۔ ان کے معمولات کی تفاصیل میں اور سیاسی حوالے سے اشارات بھی ملتے ہیں۔ متعدد مقامات پر قرآن اور دعا سے استمداد کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اپنی پیاری بٹیا جی، کے نام ۲۱ مکاتیب ہیں جب کہ ایک منہ بولی بیٹی اور ایک سمدھی کے نام ہے۔ مکاتیب کے اواخر میں آخری خطِ تحریر کا عکس بھی ہے اور انتقال سے چند روز قبل کا احوال بھی..... ان مکاتیب میں متذکرہ اشارات پر جو عنصر سب سے حاوی ہے وہ بہر حال محبت و شیفتگی، سے عبارت ہے، انداز اکثر مقامات پر ایسا ہو جاتا ہے:

''بانو کو گود میں لے کر میرے منہ سے پیار کرو اور کہو یہ نانا ابّا کا پیار ہے اور تم خود اس سے پیار لو اور کہلواؤ کہ یہ ابّا جی کا پیار ہے۔''

یوں افکار و مکاتیب پر مبنی یہ کتاب ''سیّدی وابی'' اس سلسلے کی کتب میں عمدہ اضافہ ہے۔ تازگیِ بیان، اسلوب کی ندرت، حواشی کے اندراج، بے مثل حافظے اور شعریت کے اظہار اور جزئیات نگاری کے سلیقے نے اسے امتیاز عطا کیا ہے۔ بالخصوص اس سوانحی کتاب کو دو حصوں میں منقسم کرنے سے نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پہلا حصہ بیٹی کی زبانی ہے اور دوسرا والد کی زبانی بیان ہو رہا ہے..... یوں محبت و ارادت کا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے اور سیّدہ اُمِّ کفیل مرحومہ نے قرضِ محبت ادا کر دیا ہے۔

☆☆☆